Fikr-o-Nasar (Islamabad) 4:7 (1967)

اسلام اور نظام کائنات

محمد مظہر الدین صدیقی، ریڈر ادارہ تحقیقات اسلامی

ہمارے بعض اہلِ قلم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلام کائناتِ فطرت کے قوانین کی اطاعت کا نام ہے۔ ان کے نزدیک تمام اشیائے فطرت بالاصل مسلم ہیں اور انسان بھی جہاں تک کہ وہ قوانین فطرت کا تابع رہنے پر مجبور ہے، اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مولانا مودودی لکھتے ہیں :-

"یہ زبردست قانون جس کی بندش میں بڑے بڑے سیّاروں سے لے کر زمین کا ایک چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ تک جکڑا ہوا ہے، ایک بڑے حاکم کا بنایا ہوا قانون ہے۔ ساری کائنات اور کائنات کی ہر چیز اس حاکم کی مطیع و فرمانبردار ہے۔ کیونکہ وہ اسی کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت و فرمانبرداری کر رہی ہے۔ اس لحاظ سے ساری کائنات کا مذہب اسلام ہے۔ کیونکہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کو اسلام کہتے ہیں۔ سورج، چاند اور تارے سب مسلم ہیں۔ زمین بھی مسلم ہے۔ ہوا، پانی اور روشنی بھی مسلم ہے۔ درخت، پتھر اور جانور بھی مسلم ہیں۔ اور وہ انسان بھی جو خدا کو نہیں پہچانتا اور خدا کا انکار کرتا ہے جو خدا کے سوا دوسروں کو پوجتا ہے۔ جو خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتا ہے۔ ہاں وہ بھی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے مسلم ہی ہے۔ کیونکہ اس کا پیدا ہونا، زندہ رہنا اور مرنا سب کچھ خدا کے قانون ہی کے ماتحت ہے۔" (رسالہ دینیات۔ لاہور ۱۹۶۳ء ص ۱۱-۱۲)

اسی طرح ہمارے ایک اور مشہور اہل قلم غلام احمد صاحب پرویز بھی قوانین فطرت کی اطاعت دین الٰہی قرار دیتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں :-

قرآن حکیم نے اس تحیّر انگیز نظامِ کائنات کو ایک لفظ میں بیان کر دیا ہے اور وہ لفظ ہے اسلام اور اسی کو دین اللہ کہا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے: افغیر دین اللہِ یبغون ولہٗ اسلم من فی السمٰوٰت والارض طوعاً وکرھاً والیہ یرجعون $\frac{۱۳}{۸۲}$ ..... اس سے ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر شے کا دین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(نظام زندگی) اسلام ہے۔ ہر شے قوانین خداوندی کی اطاعت کر رہی ہے۔۔۔۔ بل لہٗ ما فی السمٰوٰت والارض کل لہ قانتون (۲/۱۱۶)" (سلسبیل۔۔۔۔ لاہور۔ پہلا ایڈیشن۔ صفحہ ۱۹۰، ۱۹۱)

اب اگر یہ مان لیا جائے کہ نظام کائنات جن اصولوں پر چل رہا ہے، انہیں کا اتباع دراصل اسلامی نظام حیات کا اتباع ہے تو اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جس معاشرہ کی تشکیل میں نظام کائنات کے اصولوں کو زیادہ سے زیادہ مرعی رکھا گیا ہو، وہی معاشرہ اسلام سے قریب تر ہوگا کیونکہ اس کا دین یا نظامِ زندگی درحقیقت اسلام ہوگا یعنی کائناتی اصولوں (COSMIC PRINCIPLES) کی اطاعت۔ اس سے ہمارا یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا کہ دنیا میں بعض ایسی قوموں نے کیوں ترقی کی، جنہیں ہمارے ہاں کے اصطلاحی اسلام سے زیادہ واسطہ نہ تھا اور خداوند کریم نے ایسی قوموں پر فوز و فلاح، دینوی کامرانی اور تمدنی غلبہ کا دروازہ کیوں کھول دیا جنہیں ہم اپنے زعم میں کافر قرار دیتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی تمدن کا غلبہ اسی وقت تک رہتا ہے جب تک وہ خدا کے بنائے ہوئے کائناتی اصولوں سے قریب تر ہوتا ہے۔ لیکن جب کوئی تمدن نظام کائنات کے اصولوں سے ہم آہنگ نہیں رہتا تو لازماً ضعف و انتشار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دنیا کا جو تمدن بھی ترقی پذیر اور وسعت پذیر ہوتا ہے وہ اسلام یعنی نظام کائنات کے اصولوں پر مبنی ہوتا ہے اور جو تمدن مائل بہ انحطاط ہوتا ہے اس میں اسلام کی خلاف ورزی کا عنصر ترقی کر جاتا ہے یعنی وہ ان اصولوں سے ہٹ جاتا ہے جن پر حیات و کائنات کا نظم قائم ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام لانے یا نہ لانے کا مسئلہ محض ہماری انفرادی زندگی کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ نظم اجتماعی یعنی سوسائٹی کی تشکیل کا بھی سوال ہے۔ کوئی فرد اس وقت تک پورے طور پر مسلم نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ سوسائٹی مسلم نہ ہو، جس میں وہ زندگی بسر کرتا ہے کیونکہ فرد بڑی حد تک اصولوں، قوانین اور رسم و رواج کا پابند ہوتا ہے۔ اس لئے اگر سوسائٹی کی تشکیل میں نظام فطرت و نظام حیات و کائنات کے اصولوں کو مرعی نہیں رکھا گیا ہے تو اس کے افراد کا مسلم ہونا مشکل ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ نظام کائنات کے اصولوں پر از خود عمل پیرا نہیں ہو سکتے۔ البتہ افراد اپنی سوسائٹی کو تبدیل کر سکتے ہیں، مگر اس کے لئے بھی باہمی تعاون و تنظیم کی ضرورت پڑتی ہے۔

لیکن اس سلسلے میں ہمارے ان دونوں اہلِ قلم نے اسلام کے انفرادی پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور انسانی اختیار کی محدودیت کو پیشِ نظر نہیں رکھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام لانے یا نہ لانے کا فیصلہ

زیادہ تر فرد سے متعلق ہے اور اس معاملہ میں بھی فرد کے اختیارات لامحدود ہیں۔ مثلاً مولانا مودودی لکھتے ہیں:۔

ایک انسان وہ ہے جو اپنے خالق کو پہچانتا ہے، اس کو اپنا آقا اور مالک تسلیم کرتا ہے اور اپنی زندگی کے اختیاری حصہ میں بھی وہ اسی کے پسند کیئے ہوئے قانون کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ یہ پورا مسلم ہے اس کا اسلام مکمل ہو گیا۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا انسان وہ ہے جو مسلم پیدا ہوا اور اپنی زندگی بھر بے جانے بوجھے مسلم رہا مگر اپنے علم اور عقل کی قوت سے کام لے کر اُس نے خدا کو نہ پہچانا اور اپنے اختیار کی حد میں اس نے خدا کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ شخص کافر ہے"۔ (رسالہ دینیات۔ لاہور ۱۹۶۳ء۔ صفحہ ۱۳، ۱۴)

اس طرز خیال کی وجہ سے اسلام کا دائرہ بہت محدود قرار پاتا ہے یعنی اسلام صرف انہیں اصولوں اور قوانین کا نام ہے جن پر فرد عمل کر سکتا ہو جبکہ اس کی سوسائٹی ان اصولوں کے خلاف چل رہی ہو۔ حالانکہ اکثر افراد کے لیئے یہ مشکل ہے کہ وہ سوسائٹی کے دباؤ سے آزاد ہو کر اپنی عقل و فہم کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ بیشتر افراد ان اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے جن پر ان کی سوسائٹی قائم ہو۔ بلکہ وہ سوسائٹی کا اتباع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اب اگر اسلام ایک نظام حیات ہے جو تنظیم کائنات کے اصولوں سے ہم آہنگ ہو تو اس نظام حیات کی تلاش محض افراد کی زندگی میں نہیں بلکہ سوسائٹی کے نظم میں بھی کرنی ہوگی۔

اسی طرح غلام احمد صاحب پرویز لکھتے ہیں:۔

"یہی وجہ ہے کہ (انسان کے علاوہ) کائنات کی ہر شے ان قوانین کی اطاعت از خود کیئے جا رہی ہے جو اس کے لیئے خدا نے تجویز کیئے ہیں۔ اگر انسانی ذات سے متعلق اصول و قوانین بھی ہر انسانی بچے کے اندر پیدائش ہی کے ساتھ ودیعت کر دیئے جاتے تو انسان بھی ان قوانین کی اطاعت پر مجبور ہو جاتا اور یہ چیز اس کے صاحب اختیار و ارادہ ہونے کے یکسر منافی ہوتی۔ اس کے لئے مشیت نے یہ پروگرام مقرر کیا ہے کہ یہ قوانین انسانوں میں سے ایک منتخب ہستی کو بذریعہ وحی دے دیئے جاتے ہیں اور کہہ دیا جاتا ہے کہ اسے ان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو انہیں اختیار کریں اور چاہیں تو ان سے انکار کر کے اپنے لئے کوئی اور راستہ تجویز کر لیں"۔

(سلسبیل۔ لاہور۔ پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۹۸)

اس طرز خیال پر بھی یہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہاں فرد کو ضرورت سے زیادہ صاحب اختیار قرار دیا گیا ہے۔ اور سوسائٹی کی اہمیت کا واجبی لحاظ نہیں کیا گیا۔ یہ کہنا تو صحیح ہے کہ وحی کے ذریعہ بعض فطری قوانین کا انکشاف کر دیا گیا ہے اور اس کے بعد فرد کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کی اطاعت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ لیکن یہاں اس بات کو فراموش کر دیا گیا ہے کہ جو شخص وحی کے منکشف کردہ قوانین کی اطاعت کرنا چاہے گا اسے لازماً مسلم سوسائٹی میں شامل ہونا پڑے گا۔ باقی اگر وہ یہ چاہے کہ اپنی کافرانہ سوسائٹی میں رہ کر یا سب انسانوں سے الگ تھلگ ہو کر کائناتی اصولوں کے مطابق زندگی گزارے تو اس کے لئے یہ ناممکن ہوگا۔ اسی لئے پرویز صاحب کے قول کا اطلاق ان معاشروں پر بھی نہیں ہو سکتا جو اسلامی سوسائٹی سے بالکل الگ اور خود مختارانہ طور پر اپنے اختیار کردہ اصولوں پر منظم ہوں۔ ایسے معاشروں کے افراد تک اوّل تو اسلام کی آواز پہنچے گی ہی نہیں اور اگر پہنچ گئی تو اس کا کوئی رکن اس وقت تک اسلام یا تنظیم حیات و کائنات کے اصولوں پر عمل پیرا نہیں ہو سکے گا جب تک وہ اس سوسائٹی میں مطلوبہ انقلاب نہ پیدا کر دے یا اسے چھوڑ کر اسلامی سوسائٹی میں نہ آ جائے یعنی ایسی سوسائٹی میں جو اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے کائنائی اصولوں کے قریب تر ہو

اب تک ہم نے جو بحث کی ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کو ابتدائی طور پر سوسائٹی کی تشکیل سے خاص تعلق ہے اور فرد سے اس کا معاملہ صرف اس حد تک ہے جہاں تک اس کے افکار و اعمال سوسائٹی کی تنظیم پر مؤثر ہوتے ہیں۔ دوئم اسلام اس نظام حیات کا نام ہے جو تنظیم کائنات کے اصولوں سے ہم آہنگ ہو یعنی اگر کائنات و حیات میں خدا کی حکمرانی کے اصول معلوم ہو جائیں اور پھر کسی سوسائٹی کی تشکیل ان اصولوں کے مطابق عمل میں آئے تو جس حد تک وہ سوسائٹی ان کائناتی اصولوں کو اپنی تنظیم میں منعکس کرے گی اسی حد تک وہ اسلام سے قریب تر ہو گی۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے اصول حکمرانی معلوم کرے اور ان کے مطابق اپنی اجتماعی زندگی کو تشکیل دے۔ چنانچہ جن قوموں نے شعوری یا غیر شعوری طور سے اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ قوانین فطرت کی اطاعت کی اللہ نے انہیں کامرانی اور سربلندی سے سرفراز فرمایا۔ قرآن نے جو اصول زندگی بیان کئے ہیں وہ یہی نوامیس فطرت ہیں جن کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے۔ ان اصولوں اور نوامیس کو قوانین بھی کہا جا سکتا ہے لیکن وہ ان قوانین سے مختلف ہیں جو مثلاً چوری۔ زناکاری یا شراب خوری سے متعلق ہیں۔ یہ آخر الذکر قوانین جزئی قوانین ہیں جو تنظیم حیات و کائنات کے اصولوں سے مختلف ہیں۔ کیونکہ ان میں وہ عمومیت اور کلیت نہیں جو حیات و کائنات کی تنظیم کے اصولوں میں ہے بلکہ ان میں معاشرتی حالات کی رعایت کی گئی ہے۔ ان کی علتیں ابدی ہیں، مگر یہ خود ابدی نہیں۔ مثلاً یہ ضروری نہیں کہ چوری کی سزا میں ہاتھ ضرور کاٹے جائیں۔ ہاتھ کاٹنے یا نہ کاٹنے کا تعلق سوسائٹی کے حالات اور اس کی ارتقائی کیفیت سے ہے اور اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو محض اس امر کی سزا نہیں دی کہ وہ چور کے ہاتھ کیوں نہیں کاٹتی

اسی طرح زنا کی سزا سنگساری بھی ہو سکتی ہے. لیکن اگر معاشرتی حالات بدل جائیں تو سنگساری کی جگہ اور کوئی سزا بھی دی جا سکتی ہے. یہ جزئی قوانین نہ تو غیر متبدل ہیں اور نہ عالمگیر. البتہ وہ ان کلّی، دائمی اور عالمگیر اصولوں سے ماخوذ ہیں جن کے مطابق اللہ تعالیٰ کائنات فطرت اور کائنات انسانیت پر حکمرانی کر رہا ہے. اس لئے ان جزئی قوانین کے مقابلہ میں وہ اصول حکمرانی زیادہ اہم ہیں جن پر کائنات کا نظام چل رہا ہے اور جن کی تصریح قرآن میں جا بجا کی گئی ہے.

اب اگر ہم تنظیم حیات و کائنات کے اصولوں پر غور کریں تو ہمیں اپنی زندگی اور سوسائٹی کے لئے چند رہنما اصول ہاتھ آتے ہیں. قرآن اور اسلام کی ساری تعلیمات انہیں اصولوں پر مبنی ہیں. پہلا اصول جو حیات و کائنات میں کارفرما ہے وہ رحمت عامّہ کا اصول ہے. دوسرا اصول کلیّت یا عمومیّت کا ہے. تیسرا اصول وحدت و تنظیم کا ہے اور چوتھا اصول وظیفہ پروری کا یعنی یہ اصول کہ ہر شے کو قدرت اسی وقت تک زندہ رکھتی ہے جب تک وہ اپنا وظیفہ حیات انجام دینے کے قابل رہتی ہے. اس مضمون میں پہلے ہم ان کائناتی اصولوں پر عقلی حیثیت سے بحث کریں گے اور اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ قرآن اور اسلام نے سوسائٹی کی تنظیم میں ان اصولوں کی کہاں تک رعایت کی ہے.

رحمت عامّہ کے اصول کے تحت کائنات زندگی کی بقاء و حفاظت اور پرورش کرتی ہے اور اسے نشو و نما دے کر اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج تک پہنچاتی ہے. اگر کائنات میں یہ اصول کارفرما نہ ہوتا تو زندگی کی کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جاتی. لیکن کائنات کا پورا نظام اس طرح چل رہا ہے کہ یہاں حیات پرورش پاتی، بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے. آفتاب کا طلوع و غروب. موسم کی تبدیلی، پانی اور ہوا کی فراوانی، زمین کے اندر غذا پیدا کرنے کی صلاحیت اور انسان میں وسائل حیات سے استفادہ کرنے کی استعداد، یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہاں رحمت اور ربوبیت کا اصول کارفرما ہے. یہ صحیح ہے کہ کائنات میں تخریب و ہلاکت اور انتشار و اختلال بھی ہے مگر یہ بھی زندگی کی بقاء و پرورش اور ارتقاء کے لئے ضروری ہے. اگر موت نہ ہوتی تو زمین انسان پر تنگ ہو جاتی اور رزق کے وسائل پرورش حیات کے لئے ناکافی ہوتے. نئی نسلوں کو آگے بڑھنے اور سوسائٹی کے انتظام کو سنبھالنے کا موقع ہی نہ ملتا. وہی پرانے لوگ ہمیشہ اپنی جگہوں پر قائم رہتے اور زندگی آگے بڑھنے اور مدارج ارتقاء طے کرنے کے بجائے ایک جگہ جم کر رہ جاتی پھر یہی رحمت عامہ ہے جس نے قوانین حیات کی عمومیت یا کلیّت کی شکل اختیار کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات حیات کے تمام قوانین کلی اور عمومی نوعیت کے ہیں. ان میں افراد کی مصلحتوں اور فائدوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ وہ انسانیت کی عمومی فلاح کے اصول پر مبنی ہیں. ہوا چلتی ہے تو کبھی بیماروں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضعیفوں کو اس سے نقصان بھی پہنچ جاتا ہے سردی بڑھتی ہے تو کبھی بے کس ونادار لوگ اس کی تاب نہ لا کر موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کوئی عمارت گرتی ہے تو اس کے نیچے جتنے لوگ بیٹھے ہوتے ہیں، سبھی دب کر مر جاتے ہیں۔ خواہ وہ اولیاء ہوں یا صلحاء۔ کائنات ہر فرد کے ذاتی مصالح اور فوائد کا لحاظ نہیں کر سکتی۔ اس لئے وہ جزئی مصلحتوں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ اسے طبقوں، گروہوں، جماعتوں اور مذہبوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسے اگر دلچسپی ہے تو انسانیت کی مجموعی فلاح وصلاح اور حیات عامہ کی پرورش اور ارتقاء سے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی پوری پوری جماعتیں، قومیں اور طبقات قوانین حیات کی خلاف ورزی کی پاداش میں ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر کائنات طبقہ واریت، قوم پرستی، فرقہ بندی اور گروہ سازی کے عنصر سے عاری ہے۔ وہ صرف ایک طبقہ کو جانتی ہے یعنی انسانوں کا طبقہ۔ وہ صرف ایک قوم کو دیکھتی ہے یعنی انسانوں کی قوم۔ وہ صرف ایک فرقہ اور گروہ کے مفاد پر نظر رکھتی ہے اور یہ فرقہ اور گروہ انسانوں کا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جو سوسائٹی کائناتی اصولوں یعنی اسلام کے قوانین کے مطابق کام کرے گی اس میں طبقہ واریت، قوم پرستی، فرقہ بندی اور مذہبی گروہ سازی کی خصوصیات نہیں ہوں گی۔ کیونکہ وہ رحمت عمومی کے جذبہ سے معمور ہو گی۔ یہی رحمت عمومی کا جذبہ معاشرتی مساوات کی شکل اختیار کرتا ہے جو کبھی جمہوریت اور کبھی سوشلزم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ ان سب کا مقصد یہ ہے کہ انسانیت کے شرف و تکریم کی حفاظت کی جائے اور اس کے ارتقاء کا راستہ ہموار کیا جائے۔ یہی جذبہ قانون کی حکومت (RULE OF LAW) میں بھی کارفرما ہوتا ہے جو مساوات اور جمہوریت کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ مگر قانون کی حکومت اسی وقت کارآمد ہوتی ہے جب قوانین کا مجموعی نظام انسانی شرف و تکریم کی حفاظت کرے۔ یعنی اس میں عمومی صلاح و فلاح کا داعیہ کارفرما ہو۔ لیکن اگر کسی سوسائٹی کے قوانین میں خاص خاص طبقوں، گروہوں، جماعتوں یا کسی مخصوص مذہبی گروہ کے مفاد کی رعایت کی گئی ہو تو اس سے سوسائٹی میں ظلم و فساد پیدا ہو گا۔ انسانی اور ملکی قوانین بھی کائنات کے عمومی قوانین کی مانند کلی مصالح پر مبنی ہونے چاہئیں نہ کہ مخصوص طبقوں، گروہوں اور جماعتوں کے مفاد پر۔ پھر یہ بھی کافی نہیں ہے کہ قوانین کے وضع کرنے اور تشکیل دینے میں رحمت عامہ یعنی عمومی مفاد کی پرورش کا جذبہ کارفرما ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے نفاذ میں رحمت عامہ کے اصول پر عمل کیا جائے۔ یعنی قوانین نافذ کرتے وقت ان کی اسپرٹ اور مجموعی مقصد کو ملحوظ رکھا جائے۔ محض قانون کی لفظی تعمیل مقصود نہ ہو۔ جہاں کسی قانون کے وسیع تر مقاصد کو نظر انداز کر کے اس پر محض لفظی حیثیت سے عمل کیا جائے گا، وہاں رحمت کا اصول

ضرور مجروح ہوگا۔

اب قرآن اور اسلام کی تعلیمات پر مجموعی حیثیت سے غور کیجیئے تو معلوم ہوگا کہ ان تمام تعلیمات میں رحمت عامہ کا اصول کارفرما ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم نکتہ جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے اپنے زمانہ کے مظلوم اور پست طبقات کو جتنے حقوق عطا کیے، وہ کسی سماجی یا طبقاتی کشمکش کے نتیجہ کے طور پر نہیں دیئے گئے تھے۔ مثلاً غلاموں اور عورتوں کی معاشرتی اور انسانی سطح اس لئے بلند کی گئی کہ پرورش حیات اور ارتقائے حیات کا اقتضا یہی تھا۔ یہ تو اسلام کے دشمنوں کو بھی تسلیم ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عورتوں اور غلاموں کی حالت بہت خراب تھی اور انہیں انسانی حقوق سے بالکل محروم کر دیا گیا تھا۔ اسلام نے سوسائٹی میں ان کا مرتبہ بلند کیا اور انہیں انسانیت کی سطح تک مرتفع کیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا۔ کیا غلاموں نے کوئی حقوق مانگے تھے، یا عورتوں نے اپنے حقوق کے لئے کوئی جد و جہد کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان دو مظلوم اور پسے طبقات کے معاملہ میں اسلام نے جو طرز عمل اختیار کیا، وہ رحمت عامہ کے اصول کا نتیجہ تھا۔ اسی طرح سوسائٹی کے کسی طبقہ نے نظام زکوٰۃ کو قائم کرانے کی جد و جہد نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود اسلام نے غریب اور نادار طبقات کے معاشی حقوق کی حفاظت کے لئے نظام زکوٰۃ قائم کیا۔ یہ بھی رحمت عامہ کے اصول کے تحت کیا گیا۔ قرآن نے رسول اللہ کو رحمۃ للعالمین کے لقب سے اسی لئے نوازا کہ آپ ہی کی وساطت سے اسلام نے انسانیت کی پست سطح کو بلند کیا اور محروم الحقوق طبقات کو ان کے جائز حقوق دلوائے۔ پھر قرآن نے مسلمانوں کی جو صفات بیان کی ہیں ان میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے باہمی تعلقات میں رحمت کے جذبہ سے معمور رہتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد ہے:۔

محمد رسول اللہ والذین آمنوا معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم (سورہ فتح۔ آیت ۲۸)

("محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں ایک دوسرے کے لئے رحیم ہیں")

لیکن سوال یہ ہے کہ رحماء کی یہ صفت افراد کے ذاتی تعلقات تک محدود ہونی چاہیئے یا مختلف جماعتوں، گروہوں اور طبقوں کے باہمی تعلقات میں بھی یہی صفت نمایاں ہونی چاہیئے۔ قرآن نے اس صفت کو محدود معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی کی تنظیم اور مختلف گروہوں اور طبقوں کے باہمی تعلقات میں بھی رحمت عامہ کے اصول کو مد نظر رکھیں۔ ورنہ سوسائٹی کے مختلف طبقات مفادات کی باہمی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آویزش میں مبتلا ہو کر اسلامی وحدت کو نقصان پہنچائیں گے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی قوم و ملّت کی وحدت محض خوش نما نعروں اور ماضی کی عظمتوں کے تذکرہ سے قائم نہیں رہتی۔ اس کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ نئے حالات اور تقاضوں کے مطابق رحمتِ عامّہ کے اصول کو از سرِ نو بروئے کار لائے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے اپنے زمانہ میں اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے سوسائٹی کے بعض طبقات کو وہ حقوق عطا کئے جن سے وہ محروم تھے۔ اسی طرح اس نے رحمت عامّہ کے اصول کو نظام زکوٰۃ کی شکل میں متشکّل کیا تھا۔ لیکن اب مرورِ زمانہ کے ساتھ نئے نئے طبقات وجود میں آرہے ہیں اور ہر طبقہ اپنے حقوق و مفادات کی حفاظت میں سرگرداں ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ اصول رحمت کے پیشِ نظر ان نئے طبقوں کو بھی ان کے جائز حقوق کیوں نہ دیئے جائیں۔ یہی بات زکوٰۃ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسلام کی ابتداء میں مسلمانوں کے غریب اور پس ماندہ طبقوں کی معاشی امداد کے لئے یہ نظام بہت موزوں تھا۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ موجودہ زمانہ میں بھی اس کی وہی شکل قائم رہے جبکہ انسانی ضروریات بڑھتی جا رہی ہیں اور لوگوں کے سامنے صرف یہی ایک مسئلہ نہیں کہ انہیں پیٹ بھر کھانا مل جائے اور وہ بھوکے ننگے نہ رہیں۔ بلکہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنی اولاد کو زیورِ علم و تہذیب سے آراستہ کریں۔ اور دولت کی فراوانی سے جو فوائد ایک محدود طبقہ کو حاصل ہو رہے ہیں، انہیں رحمت عامّہ کے اصول کے تحت عوام الناس تک پہنچا دیں۔

اب اصول کلیّت یا عمومیت کو لیجیئے جس کی رُو سے تمام قوانین حیات و کائنات ہر فرد اور ہر طبقہ کے لئے یکساں کار فرما ہیں اور کوئی فرد بشر، کوئی گروہ اور کوئی جماعت ان کے اثر سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ قرآن نے قوانین الٰہی کی اس عمومیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:۔

لیس بامانیّکم ولا امانیّ اھل الکتاب من یعمل سوءً یُجزَ بہ (سورہ نساء - ۲۲)

(نہ تمہاری (یعنی مسلمانوں کی) آرزوؤں سے کچھ ہوتا ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں سے۔ جو بُرا عمل کرے گا اس کا نتیجہ پائے گا۔)

مطلب یہ ہے کہ خدا کے قانون کی زد سے نہ مسلمان بچ سکتے ہیں نہ اہل کتاب اور نہ کوئی دوسرا مذہبی گروہ جو جیسا عمل کرے گا ویسا ہی نتیجہ پائے گا۔ اس آیت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہاں قرآن کا اشارہ مصطلحہ قانون شریعت کی طرف نہیں۔ کیونکہ یہ تو صرف مسلمانوں کے لئے ہے۔ اہل کتاب یا دوسرے مذہبی گروہوں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس لئے یہاں قرآن کا اشارہ ان اخلاقی قوانین کی طرف ہے جن کی بناء پر قوموں کا عروج و زوال

عمل میں آتا ہے۔ یہی وہ کلّی قوانین حیات ہیں، جن پر اقوام و ملل اپنی تہذیب و تمدّن کی عمارت کھڑی کرتی ہیں۔ اور انہیں قوانین سے کسی قوم و تہذیب کے داخلی استحکام و قوت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً جس قوم کے مختلف افراد و طبقات میں باہمی مودّت ہو گی، جس میں عمل اور محنت کا جذبہ ہو گا جو عدل پسندی اور نصفت شعاری کی صفات سے آراستہ ہو گی۔ خداوند تعالیٰ کی میزان میں بالآخر اسی قوم کا پلہ بھاری ہو گا۔ وہ تو انسانوں کے دل و دماغ کو دیکھتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ان کے سوچنے سمجھنے کے کیا انداز ہیں۔ وہ زندگی میں کن باتوں کو اہمیت دیتے ہیں اور کن کو نہیں دیتے۔ ان کے اندر طبقاتیت ہے یا مساوات۔ ان کی زندگی اور ان کے ملکی قوانین میں انسانیت کے شرف و احترام کو کہاں تک مدّنظر رکھا گیا ہے۔ ان میں باہمی رواداری اور مصالحت کا جذبہ کارفرما ہے یا وہ صرف حکومت کے جبر سے دبتے ہیں۔

اسی وجہ سے قرآن نے مسلمانوں کو آپس کے معاملات میں عدل قائم رکھنے کی تاکید کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ عدل کا قانون ایک عالمگیر اور عمومی قانون ہے۔ ہر طبقہ، ہر گروہ اور ہر فرد کے مقابلہ میں قانون عدل کی بالاتری قائم رکھنی ضروری ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :۔

یاایها الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شهداء لله ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین ان یکن غنیا او فقیرا فالله اولیٰ بهما فلا تتبعوا الهویٰ ان تعدلوا (سورہ نساء ۱۳۴)

(اے مسلمانو! انصاف پر قائم رہو اللہ کے لئے گواہی دیتے ہوئے۔ اگرچہ یہ انصاف خود تمہارے نفس کے مقابلہ میں ہو یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔ یا کسی امیر یا غریب کے مقابلہ میں ہو۔ اللہ ان دونوں کا زیادہ دوست ہے۔ تو اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو ورنہ تم حق (عدل) سے روگرداں ہو جاؤ گے۔

اس کے معنے یہ ہیں کہ عدل کا قانون سب کے لئے یکساں ہے۔ خواہ امیر ہو یا غریب۔ اپنا ہو یا غیر اور اس قانون پر عمل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان خواہشات نفس کی پیروی سے پاک ہو اور خواہش نفس کی قبیح ترین شکل جو انسان کو عدل سے ہٹا دیتی ہے، انسان کا طبقاتی مفاد ہے جس کی وجہ سے وہ کمزور اور محروم الحقوق طبقات کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ اس لئے قرآن نے طبقاتی اور ذاتی مفاد کی پرستش سے منع کیا ہے۔

قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے پہلے چند حکمرانوں نے قانون کی حاکمیت اور بالاتری قائم رکھنے کی پوری پوری کوشش کی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جو پہلی تقریر کی اس میں اسی اصول کی تصریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الضعیف فیکم قوی عندی حتی آخذ لہ حقہ والقوی ضعیف عندی حتی آخذ منہ الحق۔

(میرے نزدیک ہر کمزور فریق طاقت ور ہے جب تک میں اس کو اس کا حق نہ دلوا دوں اور ہر طاقت ور فریق میرے نزدیک کمزور ہے جب تک میں اس سے کمزور کا حق نہ لے لوں۔)

قرآن نے قانون عدل کی عمومیت کے جس اصول کی تاکید کی اور حضرت ابوبکرؓ نے جس کے مطابق کام کرنے کا عزم ظاہر کیا، اس پر مؤثر طور سے عمل کرنے کے لئے گزشتہ دو صدیوں میں بعض قوموں نے جمہوری نظام سیاست اختیار کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ پیچیدہ سوسائٹی میں اس اصول پر عمل کرنے کی اور کوئی صورت بھی نہیں۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ جیسے عادل حکمران اوّل تو پیدا ہی کم ہوتے ہیں۔ دوئم اگر کوئی حکمران بذات خود عادل ہو تب بھی اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ایک وسیع سوسائٹی میں ایسے تمام معاملات کی خود چھان بین کرے جن سے افراد اور گروہوں کے حقوق کو صدمہ پہنچتا ہو۔ کیونکہ کوئی حکمران ذاتی طور سے ان اشخاص کے حالات سے واقف نہیں ہو سکتا جن کے مفادات کو کسی خاص گروہ کے طرز عمل سے نقصان پہنچ رہا ہو۔ اس لئے موجودہ جمہوری ممالک نے قانون ساز اسمبلیاں قائم کی ہیں، جن میں ہر مفاد کے نمائندے شامل ہوتے ہیں۔ یہ اسمبلیاں جو قانون بناتی ہیں اس میں انہیں تمام لوگوں کے حقوق کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو اسمبلیوں کے باہر پریس، اخبارات اور اجتماعات کے ذریعہ لوگ اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد کرتے ہیں اور رائے عامّہ کو ہمنوا بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ جب اسمبلی کے انتخابات دوبارہ ہوں تو وہ ایسے نمائندوں کو منتخب کروائیں جو ان کے حقوق کی حفاظت کر سکیں۔ پھر جب قانون بن جاتا ہے تو عدلیہ اس قانون کی محافظ ہوتی ہے اور جمہوری مملکتوں میں اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ عدلیہ کو انتظامیہ کے اثر سے آزاد رکھا جائے تاکہ طاقتور اور بااثر افراد و طبقات قانون کے نفاذ اور انصاف کے حصول میں مزاحم نہ ہوں۔

اس طرح موجودہ جمہوری نظام اس اصول عمومیّت و کلیّت کی تکمیل کی طرف ایک بڑا قدم ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے اور جس پر اسلامی احکام و قوانین مبنی ہیں۔ جمہوریت کا انکار درحقیقت اس اصول کا انکار ہے جس پر نظم کائنات چل رہا ہے اور جو اسلامی تصوّر عدل کی بنیاد و اساس ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے اپنے زمانہ میں جمہوریت کی کوئی تفصیلات معین نہیں کیں لیکن اس زمانہ میں جمہوریت کے جو لوازم قرار دیئے گئے ہیں، وہ انسان کے تاریخی تجربہ سے ماخوذ ہیں اور اسلام انسانوں کو اس بات سے نہیں روکتا کہ وہ اپنے تاریخی تجربات سے

استفادہ کریں۔

کائنات کے رہنما اصولوں میں سے ایک اہم اصول تنظیم و وحدت کا ہے۔ دنیا کی کوئی شے خالصتہً انفرادی نہیں بلکہ ہر شے کی زندگی کسی نظام سے وابستہ ہے۔ مادّہ کے ایک حقیر ذرّہ کو لیجئے۔ یہ بھی ایک وسیع تر کل کا جزو ہے۔ وہ کائنات کے دوسرے ذرات کے ساتھ تعلقات و روابط کے ایک سلسلہ میں جکڑا ہوا ہے اور خود اس ذرہ کی تحلیل کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک باقاعدہ نظام ہے۔ چنانچہ سائنس دانوں نے جب جوہر کی تحلیل کی تو معلوم ہوا کہ اس میں برق پاروں (ELECTRONS) اور پروٹون کی ایک خاص ترکیب موجود ہے۔ اگر اس ترکیب کو چھیڑ اجائے تو سارا نظام اور اس کے ساتھ خود جوہر بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ انسانی جسم کو دیکھئے تو یہ خود ایک وحدت ہے۔ جس میں ہر عضو اپنا وظیفہ انجام دے رہا ہے۔ اگر کسی وجہ سے انسانی جسم کی ترکیب و وحدت میں خلل پڑ جائے تو آدمی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ مگر انسانی جسم کوئی خود مکتفی وحدت نہیں۔ اس کا تعلق ساری بیرونی کائنات سے ہے۔ وہ آب و ہوا کی تبدیلی، ہر موسم کے تغیّرات اور غذا کی کیفیت و کمیت سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ پھر انسانی سوسائٹی کو لیجئے۔ کوئی فرد تنہا زندگی بسر نہیں کرتا۔ بلکہ وہ کسی جماعت، گروہ، قبیلہ یا قوم کا فرد ہوتا ہے اور اس کی ذاتی خصوصیات میں اس نظام کو بڑا دخل ہوتا ہے جس کے تحت وہ زندگی گزارتا ہے۔ جن قوموں کے افراد جمہوری نظام کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے عادات و اطوار اور قومی مزاج کی ایک خاص کیفیت ہوتی ہے۔ جو لوگ بادشاہی نظام میں رہتے ہیں، ان کے مزاج اور اطوار و افکار کا ایک خاص رنگ ہوتا ہے۔ قبائلی نظام اپنے افراد کے اندر ایک خاص سیرت پیدا کرتا ہے۔ غرضیکہ کہیں بھی خالصتہً فرد نہیں رہتا۔ بلکہ وہ کئی ایک تعلقات یا رشتوں میں جکڑا ہوتا ہے۔ اگر ان تعلقات سے اس کی فردیت کو الگ کر دیا جائے تو وہ ایک خاص جسمانی وجود کی حیثیت سے تو باقی رہتا ہے لیکن اس کی وہ خصوصیات قائم نہیں رہتیں، جن سے اس کی سیرت ترکیب پاتی ہے۔ پھر قومیں اور جماعتیں بھی اپنا مستقل اور خود مختار وجود نہیں رکھتیں۔ کسی نہ کسی صورت میں وہ انسانیت کے وسیع تر تعلقات میں جکڑی ہوتی ہیں۔ اس لئے نہ تو کوئی فرد خود مکتفی ہوتا ہے اور نہ کوئی قوم۔ ہر قوم کو دوسری قوموں اور ہر جماعت کو دوسری جماعتوں سے روابط رکھنے پڑتے ہیں۔ جن سے اس کا مزاج اور اس کی خصوصیات متاثر ہوتی ہیں۔ قومی زندگی وسیع تر انسانی زندگی کا ایک حصہ ہے اور جو قوم اس حقیقت کو نظر انداز کرنا چاہتی ہے، اس کو جلد یا بدیر اپنے اس غلط نقطۂ نظر کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ غرضیکہ کائنات کا یہ سارا نظام چھوٹی چھوٹی تنظیموں سے لے کر وسیع تر تنظیموں پر مشتمل ہے۔ ہر جگہ تنظیم و وحدت اصول حیات اور تحلیل و انتشار اصول ہلاکت ہے۔ چنانچہ جب جسم کے مختلف اعضاء میں ارتباط قائم نہیں رہتا تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسان بیماری یا موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب سوسائٹی میں انفرادیت اور طبقاتیت زیادہ ہو جاتی ہے اور اس کے افراد و طبقات اجتماعی اصولوں، قوانین عامّہ اور عمومی مفاد کی پروا نہیں کرتے تو اس میں کوئی حقیقی وحدت قائم نہیں رہتی اور وہ بدنظمی میں مبتلا ہو کر مائل بہ انحطاط ہو جاتی ہے ایسی سوسائٹی میں جو ظاہری نظم قائم رہتا ہے وہ بھی حکومت کے جبر سے، لیکن قوموں کی زندگی میں جبر کا عنصر جتنا زیادہ ہوگا، اسی قدر وہ داخلی حیثیت سے کمزور ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات فطرت و انسانیت میں جو نظامات اور وحدتیں پائی جاتی ہیں وہ اپنی داخلی قوت کے ذریعہ قائم رہتی ہیں، بیرونی دباؤ کے ذریعہ نہیں۔ مثلاً اگر انسانی جسم کے مختلف اعضاء میں تعاون مفقود ہو جائے اور اس کی اندرونی ترکیب میں خلل آجائے تو صرف دواؤں یا غذاؤں کے ذریعہ جسم کے داخلی اتحاد کو بحال نہیں کیا جا سکتا۔

اسی سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ سوسائٹی کی اخلاقی صفات و اقدار کا تعلق اس بات سے ہے کہ وہ اجتماعی نظم و وحدت کے قیام میں کہاں تک ممد و معاون ہوتی ہیں۔ ہر وہ چیز نیکی ہے جس سے افراد کے باہمی رشتے اور طبقات کے باہمی روابط مضبوط و استوار ہوں اور ہر وہ چیز برائی ہے جس سے لوگوں کے اندر باہمی تنفّر، عناد اور بغض و حسد کے جذبات پیدا ہوں۔ جھوٹ، فریب، زنا، شراب خوری، رشوت ستانی اور اسی قسم کی دیگر برائیوں کو اس وجہ سے ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے کہ ان سے افراد اور گروہوں کے باہمی تعلقات میں الفت اور مودّت کے بجائے مخاصمت اور نفرت پیدا ہوتی ہے اور اجتماعی نظم کمزور پڑ جاتا ہے۔ انصاف، صداقت شعاری، باہمی تعاون اور ایک دوسرے کے مفاد کو ملحوظ رکھنے کو نیکی اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ ان سے افراد اور طبقات کے باہمی تعلقات خوشگوار ہوتے ہیں اور اجتماعی وحدت مضبوط تر ہو جاتی ہے۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ کائنات میں کوئی شے خالص فردی حیثیت سے زندہ نہیں رہتی۔ بلکہ ہر جزو کا ایک کُل ہوتا ہے اور ہر فرد کسی تنظیم یا وحدت میں شامل ہو کر زندگی گزارتا ہے۔ یہی حال مختلف وحدتوں اور تنظیموں کا ہے۔ یعنی یہ تنظیمیں اور وحدتیں وسیع تر اور ترقی پذیر وحدتوں میں شامل ہو کر باقی رہ سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں کسی ایک تمدن کا غلبہ رہا ہے۔ کیونکہ ایک غالب تمدّن درحقیقت ایک ترقی پذیر اور وسیع تر وحدت ہوتا ہے جو چھوٹی چھوٹی وحدتوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ اسلام سے پہلے مشرق و مغرب کی مختلف اقوام رومی تمدن کے ماتحت زندہ تھیں۔ اسلام کے بعد ان میں سے بیشتر اقوام اسلامی تمدّن کے تحت آگئیں۔ اسپین سے لیکر ہندوستان اور انڈونیشیا تک اسلامی تمدّن کا اثر پھیلا ہوا تھا۔ پھر جب مغربی تمدن کا عروج ہوا تو کثیر اقوامِ مشرق اس تمدّن کے زیر سایہ آگئیں۔ اس طرح تاریخ میں دو عمل مسلسل جاری رہتے ہیں۔

ایک یہ کہ چھوٹی چھوٹی تنظیمات اور وحدتیں وسیع تر وحدتوں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ دوئم خود وسیع تر وحدتوں کا انحلال ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ کوئی وسیع تر وحدت زیادہ عرصہ تک ترقی پذیر نہیں رہتی اور جب اس کی ترقی پذیری ختم ہو جاتی ہے تو اس کے اندر انتشار اور بدنظمی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس طرح جب کوئی وسیع تر وحدت ٹوٹتی ہے تو کچھ عرصہ بعد اس کی جگہ ایک نئی ترقی پذیر اور وسیع تر وحدت تشکیل پاتی ہے اس درمیانی عرصہ میں بہت سی قوموں کو جو تحلیل شدہ وحدت کا جزو تھیں، بدنظمی اور انتشار کے دور سے گزرنا پڑتا ہے۔ پھر جب کوئی نئی ترقی پذیر اور وسیع تر وحدت تشکیل پذیر ہو جاتی ہے تو یہ چھوٹی چھوٹی وحدتیں (یعنی قومیں) اس کے تحت آجاتی ہیں۔ اس طرح کائنات میں وسیع تر ترقی پذیر وحدتوں کی تشکیل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ہر وسیع تر اور ترقی پذیر وحدت سابقہ وحدتوں کے تجربات سے مستفید ہوتی ہے اور اس کے بعض اصولوں کو اپنے نظام میں جذب کر لیتی ہے۔ لیکن کوئی نئی وحدت سابقہ وحدت کا احیاء نہیں ہوتی۔ کیونکہ کائنات میں کوئی پرانی چیز بجنسہ از سرِ نو زندہ نہیں ہوتی۔ جو تمدنی نظام ایک مرتبہ اپنا وظیفہ انجام دے کر ختم ہو گیا وہ آئندہ تمدنوں اور تہذیبوں کی ترکیب میں تو شامل ہو سکتا ہے لیکن دوبارہ من و عن زندہ اور مجسم ہو کر سامنے نہیں آسکتا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی فرد مرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں نہیں آتا۔ اگرچہ اس کی بعض خصوصیات اس کی اولاد میں منتقل ہو جاتی ہیں۔

اس بحث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اوّلاً کسی قوم سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے ماضی کو از سرِ نو دہرائے گی، صحیح نہیں۔ ماضی پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ البتہ انسان بحیثیت فرد اور جماعت ماضی کے تجربات سے سبق لے سکتا ہے۔ اور اس کے صحت مند عناصر کو اپنی جدید زندگی میں سمو سکتا ہے لیکن اس کو ماضی کے بعض عناصر اپنی زندگی سے خارج بھی کرنے پڑتے ہیں۔ بالخصوص ایسے عناصر جن کا اس کی ہم عصر زندگی میں کوئی وظیفہ نہ ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی انسانی وحدتیں مؤثر زندگی نہیں بسر کر سکتیں۔ انہیں لازماً کسی بڑی وحدت کا تابع ہو کر رہنا پڑتا ہے۔ مؤثر اجتماعی زندگی کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ایک ترقی پذیر اور وسیع تر وحدت کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ ایسے افکار اور نظری اوصاف پیش کئے جائیں جن میں چھوٹی چھوٹی وحدتیں بھی شریک ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر غالب تمدن میں عالمگیریت کا ایک عنصر تھا اور جس تمدن نے بھی ترقی کر کے چھوٹی چھوٹی قوموں کو اپنے اندر سمویا، اس نے اپنے عالمگیر اصولوں کے ذریعہ ایسا کیا۔ رومی تمدن نے ایک عالمگیر ضابطہ قانون پیش کیا جس کے تحت بہت سی چھوٹی قومیں زندگی بسر کرتی تھیں۔ اسلام نے مساوات اور مذہبی رواداری کا ایسا مؤثر نظام قائم کیا کہ اکثر قوموں کے افراد نے اپنی انسانی عزت و تکریم کی بحالی اور مساوات کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حصول کی خاطر اسلام کے دامن میں پناہ لی۔ اور جو لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل نہیں ہوئے، انھوں نے بھی مذہبی رواداری کے حصول کے لئے اسلامی نظام حکومت کے تحت رہنا پسند کیا۔ مغربی تمدّن نے عالمگیر سائنسی اور علمی افکار پیدا کئے اور نظم و نسق کے فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر ایک فلاحی طرز کا نظم و نسق اختیار کیا۔ جس کی وجہ سے پس ماندہ قوموں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ کیوں کہ ان قوموں کے اعلیٰ طبقات اور حکمرانوں میں فلاح انسانی کا جذبہ تقریباً مفقود ہو گیا تھا۔

اس سلسلہ میں ایک بات یہ یاد رکھنی چاہیئے کہ جب ایک وسعت پذیر تمدّن ایک غالب قوت کی حیثیت سے دوسری انسانی وحدتوں اور تنظیموں کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کرتا ہے تو کچھ قومیں اور وحدتیں اس کے خلاف ہتھیار اٹھاتی ہیں اور اس کی مزاحمت میں قوت کا استعمال کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں اس وسعت پذیر تمدن کو لازماً ان کے خلاف طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے۔ یہ فعل انسانیت نوازی کے خلاف نہیں، بلکہ رحمت عامہ کا ایک پہلو ہے کیونکہ اگر ایک اعلیٰ تر تمدن کی راہ میں حائل ہونے والی قوتوں کو باقی رہنے دیا جائے اس سے انسانیت کو بحیثیت مجموعی نقصان ہوگا۔ رحمت عامہ کے فوائد سے مزاحم وحدتوں اور قوموں کے افراد محروم رہ جائیں گے۔

اب دیکھیئے کہ اسلام اپنے نظام میں وحدت و تنظیم کے اصول کو کہاں تک مدّنظر رکھتا ہے۔ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ اسلام نے ایک عالمگیر انسانی وحدت کے قیام کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ اس وحدت کے قیام کے لئے ایک پورا نظام اطاعت وضع کیا گیا۔ یعنی اللہ کی اطاعت، رسول کی اطاعت اور قانون شریعت کی اطاعت۔ اللہ کی اطاعت محض کسی مابعد الطبیعاتی وجود کی اطاعت نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ان عالمگیر اقدار حیات کی اطاعت بھی تھی جن پر اسلامی سوسائٹی کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ رسول کی اطاعت اس لئے ضروری تھی کہ وہ ان عالمگیر اقدار حیات کا شارح تھا اور ان پر سوسائٹی کی تنظیم کر رہا تھا۔ قانون شریعت دراصل ان احکامات کی اطاعت تھی جو اسلام کے عالمگیر اقدار حیات سے ماخوذ تھے اور جن کی عملی تفصیلات میں اس زمانے کے حالات اور اس سوسائٹی کے درجۂ ارتقا کی رعایت کی گئی تھی۔ بہرحال یہ سارا نظام عدل و توازن کی روح سے معمور تھا جس کے بغیر کوئی وحدت قائم نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام جس ملک اور جس معاشرہ میں داخل ہوا، اس کے کمزور اور بے اثر طبقات نے اس کی دعوت کو لبیک کہا۔ کیوں کہ انہیں اسلامی سوسائٹی میں وہ مقام حاصل ہو جاتا تھا، جو خود اپنی سوسائٹی میں وہ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ پھر اسلام نے جس وحدت کی بنیاد ڈالی، وہ ایک ترقی پذیر وحدت بھی یعنی اس میں دوسری اقوام اور دوسری تہذیبوں کی بہ نسبت انسانیت کی شرف و تکریم کا زیادہ لحاظ رکھا گیا تھا

جب تک اسلامی تمدن ایک ترقی پذیر وحدت کی حیثیت سے قائم رہا، اس نے انسانیت کے ترفع اور کمال میں دوسری قوموں کی بہ نسبت بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ وہ جہاں گیا، اس نے غلاموں اور نیم غلام کسانوں کی حالت کو بدل دیا۔ عورتوں کو قعر مذلّت سے نکالا۔ طاقت ور طبقات اور با اثر جماعتوں سے قانون کی بالاتری تسلیم کرائی اور فی الجملہ سوسائٹی میں عدل و توازن پیدا کیا۔ لیکن جب اسلامی وحدت کی ترقی پذیری ختم ہوگئی اور اس کا نظام عدل کی اسپرٹ سے خالی ہوگیا۔ جب اس میں حقوق یافتہ طبقات پیدا ہوگئے اور بعض طبقات محروم الحقوق ہوگئے تو مسلم سوسائٹی کی وسعت پذیری رک گئی۔ اور اس میں جماؤ اور انجماد پیدا ہونے لگا۔ اس نوبت پر مغربی اقوام نے ایک نئی وسعت پذیر اور ترقی پذیر وحدت قائم کی اور بیشتر اسلامی اقوام کو اپنے زیر نگیں کر لیا۔ تاریخ میں یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے اور جاری رہے گا۔ اب اسلامی تمدّن کا احیاء اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ انسانیت کے گزشتہ تجربات سے استفادہ کر کے ایک عالمگیر اور ترقی پذیر وحدت بن جائے اور انسانیت کے ترفع میں مؤثر کردار ادا کرے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے علماء اور ارباب مذہب دیگر اقوام اور تہذیبوں کے تاریخی تجربات کو کوئی وزن نہیں دیتے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کے قافلہ کو پھر وہیں سے روانہ ہونا چاہیے، جہاں خلافت راشدہ کے بعد وہ ٹھہر گیا تھا۔ اور تیرہ سو سال کے اس درمیانی عرصہ میں دنیا نے افکار و نظریات اور علم و تمدن میں جو ترقی کی ہے۔ اس سے مسلمانوں کو کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیئے کیونکہ یہ سب نئی جاہلیت ہے۔ قرآن تو نبیؐ کی زبان سے کہلواتا ہے۔ ربّ زدنی علماً (اے میرے پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما) لیکن ہمارے علماء کے سامنے جب کوئی نیا علم اور نئی تحقیق پیش کی جاتی ہے، بالخصوص اگر اس کی پیش کرنے والی قوم مسلمان نہ ہو تو وہ اس کو جاہلیت جدیدہ کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں۔ پھر جس قوم کو نئے علم اور نئی بصیرت سے اتنا متنفر کر دیا گیا ہو، وہ ارتقائے حیات اور انسانیت کے مزید ترفّع میں کیا حصّہ لے سکتی ہے اور کوئی ترقی پذیر اور وسعت پذیر وحدت کس طرح قائم کر سکتی ہے؟

پرانی وحدتوں کی شکست اور نئی وحدتوں کے قیام کے اصول کی طرف قرآن نے بعض واضح اشارات کئے ہیں۔ مثلاً وہ فرماتا ہے۔ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعضٍ لفسدت الارضُ (البقرہ - ۲۵۰) یعنی جب کسی وحدت (یعنی قوم و تمدّن) کا وجود انسان کے لئے خرابی اور ظلم کا باعث بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے خلاف کسی اور وحدت (قوم یا جماعت) کو کھڑا کر دیتا ہے اور پھر ان دونوں کے مابین ایک کش مکش شروع ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غالب وحدت (قوم یا جماعت) کو شکست اٹھانی پڑتی ہے اور اس کا نظام زندگی درہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برہم ہو جاتا ہے۔ اگر اللہ ایسا نہ کرے، اور زمین پر ہمیشہ کسی ایک قوم، جماعت یا گروہ کا اقتدار قائم رہے تو دنیا ظلم و فساد کی آماجگاہ بن جائے۔ اسی طرح قرآن کا ارشاد ہے: وکم من فئۃٍ قلیلۃٍ غلبت فئۃً کثیرۃً باذن اللہِ (البقرہ - ۲۴۸) یعنی کسی وحدت کے قیام کا دارومدار محض اس کے افراد کی تعداد یا اس کے معاشی وسائل کی کثرت پر نہیں ہوتا بلکہ اس کے داخلی استحکام اور اندرونی نظم پر ہوتا ہے۔ اس لئے جب کسی وسیع تر وحدت میں ظلم و فساد اور بدنظمی پیدا ہوتی ہے اور اس کا وجود انسانیت کے لئے نفع بخش نہیں رہتا تو اس کو کسی اور وحدت کے ہاتھوں مٹا دیا جاتا ہے جو تعداد اور وسائل معیشت کے اعتبار سے اتنی قوی نہیں ہوتی لیکن اپنے نظامِ زندگی کے عدل و توازن اور داخلی نظم و استحکام کے اعتبار سے طاقتور ہوتی ہے۔ پھر جب یہ وحدت فتح مند ہو جاتی ہے تو وسعت پذیر ہو کر تعداد اور معاشی طاقت کے لحاظ سے بھی ترقی کر جاتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

لا یدعُ احدٌ منکم الجہاد فانّہُ لا یدعہُ قومٌ الّا ضربھم اللہُ بالذلِّ۔

(تم میں سے کوئی جہاد ترک نہ کرے کیونکہ کوئی قوم جو جہاد ترک کر دیتی ہے اللہ تعالیٰ اسے ذلّت کی مار دیتا ہے)

یعنی اگر کوئی وحدت (قوم یا تہذیب) اپنے داخلی استحکام اور اندرونی نظم کو برقرار رکھنے کے لئے مال و جان کی قربانی نہیں دے سکتی تو اللہ تعالےٰ اس کو کسی اور وحدت (قوم یا تہذیب) کے ہاتھوں ذلیل کر دیتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاد بھی اصول وحدت کا ایک پہلو یعنی کسی وحدت کی حفاظت اور بقاء کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے اجزاء (افراد) میں جہاد یعنی نفس و مال کی قربانی کا جذبہ موجود ہو۔

کائنات کا ایک اور اصول جس پر سوسائٹی کی تنظیم عمل میں آنی چاہیئے، اس کی وظیفہ پروری ہے جس سے مراد یہ ہے کہ کائنات ہر شے کو اسی وقت تک زندہ رکھتی ہے جب تک وہ اپنا مقررّہ وظیفہ انجام دیتی ہے۔ مثلاً اعضائے جسم کے لئے جو مختلف وظائف مقرر کئے گئے ہیں، اگر کوئی عضو ان وظائف کو انجام نہ دے سکے تو سارے جسم کی کارکردگی اور صحّت پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے عضو معطّل کو یا تو انسانی جسم سے خارج کر دیا جاتا ہے یا اگر اسے جسم کے اندر باقی بھی رہنے دیا جائے تو وہ عضو مردہ حالت میں باقی رہتا ہے۔ بے جان اشیاء کے لئے تو یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اپنا وظیفہ انجام دیتی ہیں یا نہیں کیونکہ وہ قوانین طبعی کے تحت اپنا کام کرتی رہتی ہیں نیز وہ اس شعور سے بھی خالی ہوتی ہیں کہ ان کا وظیفہ کیا ہے۔ لیکن ذی حیات اجسام میں انسان وہ ہستی ہے جس میں ایک حد تک یہ شعور ہوتا ہے کہ اس کو دنیا میں کسی کام کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لیکن یہ شعور مختلف افراد میں

مختلف درجوں کا ہونا ہے۔ بہت سے لوگوں کو ٹھیک طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان میں کون سی صلاحیتیں موجود ہیں اور ان صلاحیتوں کے لحاظ سے ان کا مقصد زندگی کیا ہونا چاہیئے۔ جس حد تک کوئی فرد اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے اپنا مقصدِ زندگی متعین کرنے میں ناکام رہتا ہے، اسی حد تک وہ سوسائٹی کی مجموعی صلاح وفلاح میں اپنا واجبی حصّہ ادا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ بعض لوگوں میں اپنے وظیفہ حیات اور مقصد زندگی کا شعور زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ یہی لوگ سوسائٹی کے لیڈر ہوتے ہیں۔ انبیاء علیہ السّلام میں یہ شعور بدرجہ اتم ہوتا ہے کہ دنیا میں انہیں کس مشن پر بھیجا گیا ہے۔ بہرحال جس شخص میں اپنی صلاحیتوں کا شعور اور اپنے مشن کا احساس جتنا پختہ ہوگا وہ سوسائٹی میں اتنا ہی مؤثر اور فعال ہوگا۔ اور جس شخص میں یہ شعور جتنا کم ہوگا وہ سوسائٹی کے لئے اتنا ہی کم فائدہ مند ہوگا اور جو آدمی اس احساس سے بالکل خالی ہوگا وہ درحقیقت روحانی حیثیت سے مردہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنا صحیح وظیفہ انجام نہیں دے سکتا۔ اس لئے سوسائٹی کی تنظیم میں اس بات کو خاص طور پر مدّ نظر رکھنا چاہیئے کہ لوگوں میں ان کی صلاحیتوں کا شعور پیدا ہو اور وہ ان صلاحیتوں کو نشو ونما دے سکیں، جو سوسائٹی اپنے افراد کی تعلیم کا انتظام نہیں کرتی اور جس میں عام لوگ ناخواندہ اور جاہل رہتے ہیں اس کے افراد کے اندر اپنی صلاحیتوں کا شعور کبھی نہیں پیدا ہوسکتا۔ اسی طرح جس سوسائٹی کا معاشی اور اخلاقی نظام صحت وتوازن سے عاری ہو، اس میں لوگوں کو اپنی صلاحیتوں کا شعور بھی ہو تو اس سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو نشو ونما نہیں دے سکتے۔ ایسی سوسائٹی کی مجموعی کارکردگی ناقص ہوگی۔ کیونکہ اس کے بیشتر افراد کو نہ تو اپنی صلاحیتوں کا شعور ہوگا اور نہ وہ ان صلاحیتوں کو صحیح طور پر نشو ونما دے سکیں گے۔ اس قسم کی سوسائٹی دوسری مہذب اور ترقی یافتہ اقوام کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

لیکن یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ صرف افراد کا ایک وظیفہ حیات ہوتا ہے جس کو سرانجام دینا سوسائٹی کی مجموعی کارکردگی اور فلاح وصلاح کے لئے ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانوں کے ہر طبقہ، ہر گروہ اور ہر جماعت کا ایک وظیفہ ہوتا ہے اور اس وظیفہ کی انجام دہی پر ہی اس کی زندگی اور بقاء کا دار ومدار ہے۔ قدرت ہر اُس طبقہ، جماعت اور گروہ کو اپنی راہ سے ہٹا دیتی ہے جو اپنا مقررہ وظیفہ حیات انجام نہیں دیتا۔ چنانچہ جو اقوام، طبقات اور جماعتیں عرصۂ حیات سے نابود ہوگئیں، ان کی ہلاکت اسی وجہ سے عمل میں آئی کہ قدرت ان سے جو کام لینا چاہتی تھی، وہ اس کام کو انجام نہ دے سکیں۔ اگر پوچھا جائے کہ ایک قوم کے مختلف طبقوں اور خود اقوام کا وظیفہ حیات کیا ہونا چاہیئے تو اس کا جواب عمومی انداز میں یہ دیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے ذریعہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلق خدا کی نفع رسانی مقصود ہے۔ یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی قوم شعوری حیثیت سے انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لئے کارزار حیات میں سرگرم عمل ہوتی ہے یا کوئی طبقہ شعوری طور پر دوسرے طبقوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ یقیناً قوموں، جماعتوں اور طبقوں میں شعوری طور پر اس کا احساس نہیں ہوتا کہ ان کی ذات سے خلق خدا کو فائدہ پہنچنا چاہیئے۔ لیکن ہر قوم، ہر طبقہ اور ہر جماعت اپنی نشوونما اور ترقی کے دوران ایک خاص طرز کی سیرت پیدا کرتی ہے اور اس کے تمام افعال و اعمال اس کی سیرت کے باعث وجود میں آتے ہیں۔ پھر اس کی سیرت میں جتنی بلند نظری اور وسعت نگاہ ہوگی، اسی قدر اس کا وجود دنیا کے لئے فائدہ مند ہوگا۔ مثلاً یہ بات یقینی ہے کہ انگریزوں نے دوسری قوموں کو فائدہ پہنچانے کے لئے ان پر حکومت نہیں کی لیکن انگریز جس ملک میں گیا وہاں اس نے قانون کی حکومت (RULE OF LAW) قائم کر دی کیونکہ یہ اس کے مزاج کا ایک لازمی خاصہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں یہ مثل مشہور تھی کہ برٹش انڈیا میں تدبیر چلتی ہے اور دیسی ریاستوں میں تقدیر۔ بات صرف اتنی تھی کہ دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کا کوئی قاعدہ قانون نہ تھا۔ ان کی حکومتیں مطلق العنان تھیں۔ جس شخص سے حکمران یا اس کے درباری اور امراء خوش ہو گئے، اس کی زندگی بن جاتی تھی جس سے وہ کسی بات پر ناراض ہو جاتے تھے، اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی تھی۔ اس کے برعکس برٹش انڈیا (برطانوی ہند) میں ایک قانون، قاعدہ اور اصول حکومت تھا۔ جو لوگ ان قواعد اور اصولوں کو سمجھ کر ان کے مطابق کام کرتے تھے، انگریز حکمران انہیں سے خوش رہتے تھے۔ بہر حال انگریزی دور میں لوگوں کو جو امن و امان اور انصاف حاصل تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز کی حکومت جمہوری طرز کی تھی جس میں قانون اشخاص سے بالاتر ہوتا ہے۔ یہ انگریز کے مزاج کا خاصہ تھا۔ اسی کے باعث اس کا وجود انسانیت کے لئے نفع بخش تھا۔ اگرچہ شعوری طور پر وہ اپنا فائدہ چاہتا تھا۔ لیکن اس کے فائدہ میں اوروں کا بھی فائدہ تھا۔ اس کے برعکس اگر کسی قوم، جماعت یا طبقہ کے فائدہ سے وسیع تر انسانی مفاد وابستہ نہ ہو، اگر اس میں بلند نگہی اور عالی ظرفی نہ ہو، اگر اس نے ایک مفاد پرست جماعت کی صورت اختیار کر لی ہو جس کا کام صرف قائم شدہ اغراض کی حمایت و مدافعت کرنا ہو تو یقیناً اس کے خاتمہ کا وقت قریب آن پہنچا ہے۔ علم کا میدان ہو، مذہب کا ہو یا سیاست و معیشت کا ہو، ہر شعبہ میں یہ خطرہ رہتا ہے کہ جو لوگ اس شعبہ کے سربراہ ہیں وہ اپنے مفادات کی حفاظت میں اتنے منہمک ہو جائیں کہ سوسائٹی کے مجموعی مفاد کو ان کی روش سے نقصان پہنچنے لگے۔ بجائے اس کے کہ وہ کوئی تعمیری خدمت کریں، وہ صرف اپنے فوائد کے حصول میں مصروف رہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر فرد، ہر گروہ اور ہر طبقہ اپنا فائدہ چاہتا ہے۔ لیکن یہ فائدہ وہ تعمیری خدمت کے ذریعہ حاصل کرتا ہے اور تعمیری

خدمت اسے کہتے ہیں جس سے انسانیت کے شرف و تکریم میں اضافہ ہو۔ تعمیر درحقیقت تنظیم و وحدت ہی کا ایک پہلو ہے اور ہم بتا چکے ہیں کہ کائنات میں بحیثیت مجموعی تنظیم و تحلیل کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔ ہر وجود انفرادی اور ہر وجود اجتماعی یا تو نظم و وحدت کی طرف مائل ہوتا ہے یا تحلیل و انتشار کی طرف۔ یعنی یا تو وہ زندگی کی طرف قدم بڑھاتا ہے یا موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس لئے تعمیری خدمات وہ خدمات ہیں جن سے سوسائٹی اور انسانیت کے نظم و وحدت میں اضافہ ہو اور انسانوں کے تعلقات و روابط میں استحکام اور ائتلاف پیدا ہو۔ اس کے برعکس تخریبی عمل وہ عمل ہے، جس سے معاشرہ اور انسانیت میں تحلیل و انتشار اور افراد و اقوام اور طبقات کے باہمی روابط میں استواری کی جگہ بدمزگی اور ائتلاف کی جگہ اختلاف پیدا ہو جائے۔ اس لئے جو فرد، طبقہ یا گروہ صرف اپنا فائدہ چاہتا ہے لیکن سوسائٹی کی تعمیری خدمت کے ذریعہ نہیں بلکہ دوسرے افراد، طبقات یا گروہوں کو نقصان پہنچا کر۔ وہ درحقیقت اپنا وظیفہ انجام نہیں دیتا اور اصلاح کے بجائے فساد پیدا کرتا ہے۔ کائنات ایسے گروہوں، جماعتوں اور طبقوں کو جلد یا بدیر اپنی راہ سے ہٹا دیتی ہے کیونکہ اس کے مزاج میں تنظیم و وحدت، ائتلاف و اتحاد اور اعتدال و تسویہ ہے۔ اس لئے وہ اس کے خلاف کوئی عمل زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کرتی۔

قرآن نے کائنات کے اس اصول وظیفہ پروری کی طرف کئی ایک اشارات کئے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ کہتا ہے: واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (سورہ رعد۔ آیت ۱۷) یعنی جو چیز انسانیت کے لئے نفع بخش ہوتی ہے، وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر قدرت نفع بخش اشیاء کو باقی رکھتی ہے لیکن اس عمومی اصول کا اطلاق صرف اشیائے مادی پر نہیں ہوتا بلکہ انسانی وحدتوں پر بھی ہوتا ہے یعنی اشیائے مادی کی طرح قدرت انہیں قوموں، طبقوں اور جماعتوں کو زندہ رکھتی ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر انسانیت کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ خود مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن حکیم انہیں آگاہ کرتا ہے کہ اگر وہ اپنا وظیفہ حیات ادا نہیں کریں گے یعنی انسانیت کے ترفع اور ارتقاء میں حصہ نہیں لیں گے تو خدا ان کی جگہ دوسری قوم کو کھڑا کر دے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم (الفتح۔ ۳۷) یعنی اگر تم روگردانی کرو گے تو خدا تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا۔ پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہر قوم، ہر جماعت اور ہر طبقہ اسی وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک وہ اپنا وظیفہ حیات ادا کرتا رہتا ہے یعنی انسانیت کے ارتقاء اور ترفع میں تعمیری خدمات انجام دیتا ہے۔ جب یہ کیفیت نہیں رہتی تو کچھ عرصہ بعد قدرت اسے مٹا دیتی ہے۔

اسی بات کو قرآن نے ایک اور جگہ دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جب اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوم میں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں کی تبلیغ شروع کی تو قوم کے طاقت ور اور با اثر افراد نے آپ کی مخالفت پر کمر باندھ لی اور جو لوگ حضرت شعیبؑ کی دعوت کو لبیک کہہ رہے تھے، انہیں ڈرانے دھمکانے اور ستانے لگے۔ حضرت شعیبؑ ان لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ولا تقعدوا بکلّ صراطٍ توعدون وتصدّون عن سبیل اللہِ من اٰمن بہ (الاعراف۔ ۸۶)

(اور تم لوگ ہر راستہ پر لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے نہ بیٹھو اور جو لوگ ایمان لائیں، انہیں اللہ کی راہ سے نہ روکو)

اب یہ صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ اس طرح عوام الناس کو ڈراتے دھمکاتے اور انہیں دعوتِ حق سے روکتے تھے وہ غریب اور بے کس لوگ نہیں تھے کیونکہ غریبوں میں نہ اتنی ہمّت ہوتی ہے اور نہ رعب و داب۔ وہ خود سوسائٹی میں ڈرے سہمے رہتے ہیں۔ اس لئے جن لوگوں نے حضرت شعیبؑ کی دعوت کے مقابلہ میں یہ طرزِ عمل اختیار کیا، وہ وہی لوگ ہو سکتے تھے جن کے پاس کافی دولت اور فرصت تھی۔ جب انھیں حضرت شعیبؑ کی دعوت سے خطرہ پیدا ہوا تو انھوں نے اپنی فرصت کا استعمال اس طرح کیا کہ راستوں میں بیٹھ کر حضرت شعیبؑ کے خلاف لوگوں کو ورغلاتے تھے۔ اور اگر وہ ان کے کہنے میں نہ آتے تو انہیں ڈراتے اور دھمکاتے۔ غرض کہ قرآن یہاں ایک دولت مند طبقہ کا ذکر کر رہا ہے، جو سوسائٹی میں بے وظیفہ (FUNCTIONLESS) ہو گیا تھا۔ اسی طرح ہر معاشرہ میں ایسے طبقات پیدا ہو سکتے ہیں جن کا سوسائٹی میں کوئی تعمیری اور پیداآور مشغلہ نہ ہو۔ اگر قوم نے بروقت اس صورت حال کی اصلاح نہ کی تو اس کو ان طبقوں یا جماعتوں کے تخریبی اعمال کے باعث نہایت خطرناک صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

یہ ہیں وہ چند اصول جو کائنات وحیات کے تجربہ سے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ اسلام نے انہیں اصولوں پر اپنی سوسائٹی کی تعمیر کی اور اسی لئے وہ دنیا میں پھلا پھولا اور آگے بڑھا۔ دنیا میں جتنی تہذیبوں کو فروغ ہوا وہ کچھ نقائص کے ساتھ ایک حد تک انہیں اصولوں پر مبنی تھیں اور آئندہ بھی جو تہذیب کائنات وحیات کی تنظیم کے اصولوں پر اپنی عمارت تعمیر کرے گی، وہ دنیا کی ترقی میں مؤثر اور تعمیری کردار ادا کرے گی۔ اسلام درحقیقت اس طرح کے کسی قانونی نظام کا نام نہیں ہے، جیسے حکومتوں اور سلطنتوں کا قانون ہوا کرتا ہے۔ بلکہ وہ چند رہنما اصولوں کا نام ہے۔ جن پر زندگی کی تشکیل عمل میں آنی چاہیئے۔ قرآن، فطرت اور تاریخ سے ہمیں ان عالمگیر اور کلّی اصولوں کا علم حاصل ہوتا ہے جو کائنات کی تنظیم میں داخل ہیں اور انہیں اصولوں کی اطاعت اور سوسائٹی پر ان کے اطلاق کو قوانین الٰہی کی اطاعت یعنی اسلام کہا جا سکتا ہے۔